مقالہ پڑھنے والوں کو یہ خلا محسوس تک نہیں ہونے دیا، موصوف ہر اجلاس میں اول سے آخر تک خود موجود رہے اور اپنے پرانے تلامذہ اور احباب کو شریک اجلاس ہونے پر مجبور کیا۔

ان دو مسئلوں کی اہمیت یہی نہیں کہ بحث اور مقالہ نگاری کے پیش نظر ان کو چن لیا گیا ہو۔ بلکہ آج پورے عالم اسلامی کو انھیں دو مسئلوں کا سامنا ہے۔ پہلے سوال ہی کو لیجیے۔ ایک طرف تہذیب حاضر اور اس کے مادی تقاضے ہیں۔ ارتقاء و تغیر کا فطری قانون ہے اور زندگی کے سانچوں کی تبدیلیاں ہیں۔ اور دوسری طرف ہماری وہ فقہ اور معاشرتی زندگی کا سمٹا ہوا نقشہ اور رنگ ہے جس کو گزشتہ صدیوں میں مخصوص تاریخی مناسبت سے ترتیب دیا گیا تھا، اور جو اس وقت کے حالات کے عین مطابق اور معقول تھا لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ یا تو اس کا کثیر حصہ بے کار اور فرسودہ ہو گیا ہے اور یا ایسا ہے کہ موجودہ حالات پر اس کو چسپاں کرنا مشکل ہے۔ اس فکر کے سامنے عنان توجہ کو کھینچنے والا سوال یہ ہے کہ اس پیچیدگی کو سلجھانے کی خاطر آخر کیا قدم اٹھایا جائے۔ بظاہر دو ہی صورتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اول یہ کہ موجودہ تہذیب کے رخوں کو قوت و زور اور طاقت و جبر سے اس طرح بدل کے رکھ دیا جائے کہ وہی پہلی سی ثقافتی فضا اور تمدنی حالات معرض وجود میں آجائیں جن میں زندگی کا یہ لائحہ عمل اول اول ظہور پذیر ہوا تھا۔ دوم یہ کہ اگر ایسا ہونا ناممکن ہو۔ تو ہم صورت و قالب سے ہٹ کر روح و معنویت کی طرف رجوع ہوں۔ اور یہ دیکھیں کہ اس فقہ و قانون کے پیچھے کون کون ہمہ گیر قوانین حیات پنہاں ہیں۔ اور کیونکر ان کا اطلاق موجود حالات پر عمدگی سے ہو سکتا ہے؟ یہ تو ظاہر ہی ہے۔ کہ گزشتہ ڈیڑھ دو صدی سے علوم و فنون میں جو ترقی ہو رہی ہے۔ اس کو پیچھے ڈھکیلنا محال ہے اور انسانی قافلہ کی تیز رفتاریوں کو روک کر رجعت قہقری پر مجبور کر دینا بھی آسان نہیں۔ بلکہ صحیح بھی نہیں فرض کیجیے اگر کسی معجزانہ انقلاب سے، یہ تہذیب مٹ جاتی ہے۔ یہ علوم و فنون مبدل بہ جہالت ہو جاتے ہیں۔ اور صدیوں کی جد و جہد کے بعد جو نعمتیں انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔ ان سے یہ محروم کر دیا جاتے۔ تو یہ اس کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ بنابریں آخری چارہ کار یہی رہ جاتا ہے۔ کہ اسلام کی بنیادی اور اساسی قدروں کی روشنی میں پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ اور زندگی کی ترتیب و تدوین کا کام اس طرح انجام دیا جائے کہ موجودہ دور کی ہر ہر خوبی اس میں موجود ہو۔ اور ہر اس عیب و نقص سے کنارہ کشی اختیار کی جائے جس کو خود تجربہ نے غلط ثابت کر دیا ہے۔

خذ ما صفا ودع ما کدر کا یہی وہ پرانا اصول ہے۔ جو زندہ قوموں کا شعار رہا ہے۔ اور اسی کو اپنا کر ہم زمانے کے تغیرات کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

دوسرا سوال کمیونزم اور اسلام کا رہ جاتا ہے۔ ڈھاکہ سمپوزیم میں۔ اس پر جو بحث ہوئی۔ وہ بالکل علمی سطح کی تھی۔ حالانکہ یہ مسئلہ اس سطح سے متجاوز ہو کر عمل اور قوت کی ایک خاص شکل اختیار کر چکا ہے۔ اور ایک دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے اور اب روس کے علاوہ اس کے تمام حلیف ممالک اس کی وسیع ترین جولانگاہیں ہیں۔ اب یہ صرف ایک نظریہ، ایک ملحدانہ خیال اور فلسفہ نہیں رہا۔ بلکہ ایک ایسا تجربہ حیات ہے۔ جس کے متعین ثمرات و نتائج ہیں۔ اور وہ برے بھلے جیسے بھی ہیں سب کے سامنے ہیں۔ اس لیے اس پر اظہار خیال کرتے وقت اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کہ ہم ایک نظریہ کی تکذیب یا تائید نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک حقیقت واقعی اور محسوس انداز زیست ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور ہمیں اس سے تعرض کرنا ہے۔ نقطہ نظر کے اس اختلاف کو مناسب اہمیت نہ دینے سے مخالف و موافق دونوں گروہ غلطیوں